

منزل مراد

الحمد لله

منزل مراد.....امجد جاوید

سرمنی بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ موسم بہار کی پہلی بارش سے ہر شے نکھر گئی تھی۔ اگرچہ سہ پہر کا وقت تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے شہر پر شام اتر آئی ہو۔ سڑکیں بھیگ کر زیادہ سیاہ ہو گئی تھیں۔ ایسے میں رضا سلمان نے سڑک کنارے موجود پھولوں کے ایک اسٹال کے پاس اپنی گاڑی روک دی۔ اسے رکے دیکھ کر اسٹال والے نے تیزی سے پھولوں کا گلدستہ بنایا اور گاڑی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ رضا نے پتھر سیٹ والا دروازہ کھولا، اس نے گلدستہ وہاں رکھ دیا۔ رضا نے ایک بڑا نوٹ اسے دیا تو وہ سلام کرتے ہوئے دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ رضا نے گاڑی بڑھادی۔ وہ جلد از جلد قبرستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کا پاپا سلمان اشرف ابدی نیند سو رہا تھا۔ رضا کا گذشتہ ہفتے سے یہی معمول تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاپا یوں چھڑ جائیں گے۔ وہ لندن سے پہلی دستیاب فلائٹ سے یہاں پہنچا تو پاپا کا جنازہ تیار تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں سپرد خاک کیا تھا۔ سارا دن وہ تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملتا رہتا۔ سہ پہر ہوتے ہی وہ قبرستان کا رخ کرتا۔ وہاں تھوڑا وقت گزار کر اسے سکون ملتا تھا۔

رضا نے قبرستان کے باہر بھاٹک کے پاس گاڑی روکی، گلدستہ اٹھایا اور قبرستان کے اندر چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا شہر خوشاں تھا۔ وہ پختہ روش پر آگے بڑھتا گیا۔ جبکہ اس کے پاپا کی قبر ابھی کچی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا، اس کی نگاہ ایک سیاہ پوش لڑکی پر پڑی جو بڑی شدت سے رو رہی تھی۔ سرمنی بادلوں اور سبز بیلوں کے پس منظر میں وہ سیاہ لباس پہنے، گلابی چہرے والی لڑکی ہر طرف سے بے نیاز یوں شدت سے رو رہی تھی کہ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اسے لگا جیسے آسمان سے بارش بھی تو اس لڑکی کی آنکھوں سے جاری ہو گئی ہے۔ وہ رک گیا اور پوری محویت سے اس کی شدت گریہ دیکھتا رہا۔ فطری طور پر اس نے سوچا کہ یہ کون ہے؟ ضرور کوئی گہرا چنڈ بانی تعلق ہوگا۔ بھیجی آنسو اتنی تیزی سے رواں ہے۔ اس لڑکی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے سینے کے قریب چادر کو پکڑا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد اس لڑکی نے خود پر قابو پالیا۔ پھر اپنی مخروطی انگلیوں سے گالوں پر آئے آنسو صاف کیے اور دھیرے سے مڑی۔ اس کی نگاہ سامنے کھڑے رضا پر پڑی تو وہ ایک دم ٹھک گئی۔ کتنے ہی لمحے وہ اس کے چہرے پر سے نگاہیں نہ ہٹا پائی۔ وہ یوں بے جان بت کی مانند بن گئی جیسے اس نے کچھ انہونا دیکھ لیا ہو۔ چند لمحوں میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ جس سے رضا بوکھلا سا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، وہ لڑکی ایک جھٹکے سے رخ پھیر کر اس کے قریب سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ رضا نے تجسس نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر موجود کچھ چین کے درختوں کے پاس کھڑی ادھیڑ عمر خاتون کے پاس جا کر رکی۔ اس سے پرس لیا اور قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر چل دی۔

انہی لمحات میں رضا کو احساس ہوا کہ اس کے پاپا کی قبر پر آنے والے لوگ، اس کے لیے محترم ہیں۔ اخلاقی تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کے قریب جاتا اور کسی بھی انداز سے ان کا شکریہ ادا کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاپا بہت سارے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ لوگ انہی احسان مندوں میں سے ہوں۔ اس نے گلدستہ اپنے پاپا کی قبر پر رکھا اور پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا، اس ادھیڑ عمر خاتون کے پاس جا کر سلام کیا۔ خاتون نے آنکھیں بند کر کے بڑے جذب سے جواب دیا۔ تب رضا نے بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اور؟“

”میں تقیس خاتون ہوں اور وہ میری بیٹی ہے۔“ اس نے اختصار سے جواب دیا۔

”آپ دونوں یہاں۔“ اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”وہ اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئی تھی۔“ اس نے کہا تو وہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ ان چند لفظوں نے اسے پورے وجود سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”اپنے باپ کی قبر پر..... مطلب..... آپ۔“ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا تو وہ خاتون چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بنا کچھ کہے پلٹ کر اسی جانب بڑھ گئی، جدھر اس کی بیٹی گئی تھی۔ رضا حیرت زدہ سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پاپا نے دوسری شادی کی ہوگی؟ اولاد میں ایک جوان لڑکی بھی ہوگی، جیسے اس نے چند لمحے قبل دیکھا ہے اور یہ سامنے کھڑی خاتون اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ ایک ایسے شاک میں تھا جس نے وقتی طور پر اس کی ساری سوچیں مفلوج کر کے رکھ دی تھیں۔ اس کا پاپا تو اس کی نگاہوں میں ایسے کردار کا مالک تھا کہ جس کی قسمیں کھائی جاسکتی تھیں اور یہ..... اس نے دیکھا، دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ابھی اسے خیال آیا کہ اس کے پاپا سے اتنی قربت رکھنے والے یہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟ یہ تو معلوم کرے، وہ تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ جیسے ہی وہ

پہرونی چھانک تک پہنچا۔ وہ ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی گاڑی میں سوار تھیں، جو ریگتے ہوئے تیز ہو گئی تھی۔ اس نے زور سے آواز دی، لیکن وہ نہیں رکیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ جا چکی تھیں۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس اپنے پاپا کی قبر پر آ گیا۔

رضا کے اندر بالکل مچ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لمحوں میں سب کچھ بدل گیا ہو۔ اعتماد ٹوٹ جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ وہ فاتحہ پڑھنے لگا۔ اس کی دعا میں وہ پہلے والا جذب نہیں تھا بلکہ جذب کو شک کا دیمک لگ گیا تھا۔ بلقیس خاتون کے لفظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ قبر اسے جواب نہیں دے سکتی تھی کہ وہ مطمئن ہو جاتا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر پلٹ کر قبرستان سے نکلتا چلا گیا۔

رضا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماما شبنم بیگم سے پوچھ سکتا تھا کہ پاپا نے دوسری شادی کی تھی؟ جواب ہاں میں ہوتا یا ناں میں، اس کی ماما پر کیا گزرتی، اس کا وہ احساس کر سکتا تھا۔ عورت چاہے جیسی بھی ہو، جیسے طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ اپنے مرد کے ساتھ کسی دوسری عورت کا ذکر سن کر کبھی پرسکون نہیں رہ سکتی۔ اسے محل اور صبر سے خود اس سارے معاملے کو دیکھنا تھا۔ اگر اس عورت نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے تو اس کے پاس ثبوت بھی ہوں گے۔ اس کے پاپا کی دوسری شادی ثابت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اسے تجسس ہو گیا تھا کہ اس کے پاپا کی زندگی کیسے گزری تھی۔ ایک دکھ کا احساس رضا پر تن گیا تھا، آخر پاپا نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی۔ کیا مجبوری تھی ان کی، کیسے حالات تھے ان کے ساتھ، جو وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو دنیا کے سامنے نہیں لاسکے۔ اب اگر وہ عورت اپنے دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے آ جاتی ہے تو کیا ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گے، مان جائیں گے؟ اور انہیں تسلیم کر لیں گے۔ اس کے لیے سوچوں کا در، واہو گیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی ماما کو اس معاملے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جب تک وہ خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا تھا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ قدرے پرسکون ہو گیا تھا۔

رضا کی اپنے پاپا کے آفس میں مصروفیات بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اسے بہر حال اپنے پاپا کی محنت پر رشک آ رہا تھا۔ پاپا نے کتنی محنت کی تھی، اس کا اندازہ ان کے اثاثوں سے ہو رہا تھا۔ اور وہ خوشگوار حیرت میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پاپا کی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا۔ سو پاپا کے فریبی ساتھیوں اور پرانے ملازمین کو زیادہ قریب رکھتا تھا۔ انہی میں ایک فیض الدین بھی تھا۔ جس نے سب سے زیادہ سلمان اشرف گذار تھا۔ اور شنیدہ بھی تھی کہ پاپا راز و نیاز اسی سے کرتے تھے۔ اگلی سہ پہر اس نے فیض الدین کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ چائے کے دوران گپ شپ میں اس نے اپنے پاپا کی باتیں چھیڑ دیں۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے پوچھا۔

”فیض صاحب۔! پاپا کے ساتھ آپ کی طویل رفاقت رہی ہے۔ کیا آپ کے علم میں کوئی ایسا معاملہ ہے کہ انہوں نے دوسری شادی کی ہو؟“

فیض الدین چند لمحے سر جھکائے بٹھا رہا۔ اس دوران رضا کا دل دھڑکتا رہا۔ وہ ہاں یا ناں کے درمیان اعصاب کو جھنجھوڑ دینے کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ ابھی اس نے سراٹھایا اور آہستگی سے بولا

”جی ہاں، انہوں نے دوسری شادی کی تھی۔ آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آپ کو تو اولیول کے بعد لندن بھیج دیا گیا تھا۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو بھی نہیں بتایا کہ بات چھپی ہے تو چھپی رہے یہاں تک کہ وہ دنیا میں نہیں رہے۔“

”دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں، لیکن دوسری شادی چھپانے کی انہیں مجبوری کیا تھی۔“ رضا نے انتہائی سکون سے کہا۔

”دیکھیں، میں اتنی تفصیل تو نہیں جانتا۔ ہاں وہ کبھی کبھار کافی رقم لیا کرتے تھے اور چند دن کے لیے اپنی دوسری بیگم کے پاس جاتے تھے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں۔ باقی وہ کون ہیں، کہاں رہتی ہیں۔ میں اس بارے میں نہیں جانتا۔“ فیض الدین نے بے چارگی سے کہا۔

”میں اس خاتون سے ملا ہوں اور اس کی بیٹی کو بھی دیکھا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے قبرستان والا واقعہ بیان کر دیا۔ اس دوران فیض الدین خاموشی سے سنتا رہا۔ اس وقت میرا داغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا ایسا کوئی ذریعہ ہے کہ ہم انہیں تلاش کر لیں؟“

”مگر میرا خیال ہے کہ انہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے وہ خاتون اور لڑکی اگر سلمان صاحب کی بیگم اور بیٹی ثابت ہو گئیں تو جائیداد میں بھی حصہ دار بن جائیں گی۔ وہ تو اگر سامنے آ کر بھی دعویٰ کریں تو آپ انہیں تسلیم نہ کریں۔“ فیض الدین نے خلوص سے مشورہ دیا۔

”پتہ نہیں پایا کے ساتھ کیسے حالات تھے۔ بات جانیدا کی نہیں، اُن سے ہمارے تعلق کی ہے، کیا سلمان اشرف کی بیوی اور بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ پھر اگر جانیدا میں ان کا حق ہے تو وہ انہیں ملنا چاہیے۔ فیض صاحب سمجھیں، وہ ہمارے قریبی رشتے دار ہیں۔“ رضائے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں اب وہ خود ہی سامنے آجائیں تو۔“ اس نے حیرت اور بے بسی سے کہا۔

”کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ ہم انہیں تلاش کر لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں عدالت میں یا کسی ایسے فورم پر ملیں، جہاں ہمارا یا ہمارے خاندان کا تاثر غلط چلا جائے۔ مگر یہ ساری باتیں بل از وقت ہیں۔ ہمیں ان سے مل کر کوئی بات تو کرنی چاہیے۔“ اس نے اپنا نکتہ نظر کہا۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک پرانا ڈرائیور تھا۔ وہی صاحب کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ آپ دو چار دن دیں۔ میں انہیں تلاش کر لیتا ہوں۔“ فیض الدین نے حتمی انداز میں کہا

”لیکن انتہائی رازداری کے ساتھ، پھر بعد میں جو ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔“ رضائے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو فیض سر ہلا کر رہ گیا۔



زار یہ کار یڈور میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ روشن دین کی نرم دھوپ اس کے گورے پیروں سے ذرا فاصلے پر تھی۔ عنابی رنگ کے لیدر سلپرز اور اسی رنگ کے ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا آچل کرسی سے ڈھلک کر آہستگی سے چلنے والی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تازہ اخبار تھا مگر وہ اسے نظر انداز کئے اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر فوراً توجہ حاصل کر لینے والے اس کے ہونٹ تھے۔ سرخ لعلیں ہونٹ، جن کے دائیں جانب نیچے کی طرف سیاہ تل تھا۔ غلائی آنکھوں میں ایک بے طرح کی اداسی اتری ہوئی تھی۔ تنکھے ناک میں لونگ کی جگہ ہلکی سی سونے کی تار تھی۔ لمبے اور گھنے سیاہ بالوں کی کس کر بانڈھی ہوئی چوٹی سے اس کا ماتھا بڑا کشادہ لگ رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس کے حسن میں ایسا تاثر تھا جس میں کھو جانے کی حسرت جھلک رہی ہو۔ حالانکہ گداز بدن والی زار یہ کو دیکھ کر تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ نجائے اپنی سوچوں میں آباد کس دنیا میں موجود تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم تو یہیں ہو لیکن اس کی روح کہیں اور چلی گئی ہو۔

”ناشتہ کر لیا تم نے زار یہ؟“ عقب سے بلقیس خاتون کی آواز آئی تو اس کی سوچوں کا سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔

”جی..... جی ہاں..... کر لیا۔“ اس نے چونکتے ہوئے کہا تو بلقیس نے کھڑے کھڑے کہا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”خیر۔! مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ رضا آج کسی بھی وقت یہاں آئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رک کر پھر بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”میرے حساب سے اس نے چار دن زیادہ لے لیے ہیں۔“

”کیا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نہ آئے۔“ زار یہ نے آہستگی سے پوچھا۔

”ممکن ہی نہیں ہے۔ کیا تم نے اس کا اضطراب نہیں دیکھا تھا۔ کیسے بھاگتا ہوا پھانک تک آیا تھا۔ میں اس کے سکون میں جو چنگاری لگا آئی ہوں۔ وہ بھڑکے نہ۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ آ رہا ہے۔ تم تیار رہنا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”آپ نے ہی تو کہا ہے کہ میں اس کا سامنا نہ کروں اور نہ ہی اس سے کوئی بات کروں۔ پھر میں نے کیا تیار ہونا ہے۔“ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

”ہو سکتا ہے تمہارا اور اس کا سامنا ہو ہی جائے۔ کوئی بات کرنی پڑ جائے۔ تم نے وہی کرنا ہے، جو تمہیں کہا گیا ہے۔“ بلقیس نے یوں کہا جیسے اسے سرزنش کر رہی ہو۔

”ویسے ماما! کوئی عقل مند بندہ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی جاندا کسی دوسرے کو جائے۔ وہ تو ایسے کسی بھی رشتے دار سے انکار کر دے گا۔ جس کے باعث جاندا جاتی ہوئی نظر آئے۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولی۔

”یہ میرا معاملہ ہے، میں کیا کرتی ہوں اور کیسے کرتی ہوں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ آج کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”میں تو ابھی آفس چلی جاؤں گی۔ اس دوران وہ آ کر چلا جائے تو مجھے بتا دیں۔ ورنہ میں عاتکہ کی طرف چلی جاؤں گی۔ وہیں سے

لیٹ آؤں گی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔ تمہارا اور اس کا سامنا ہی نہیں ہونا چاہئے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا اور اندر کی جانب چلی گئی۔ تب زار یہ کے چہرے پر کرب پھیل گیا۔ ان نے چند لمحے اخبار کی طرف دیکھا۔ پھر وہیں ایک طرف رکھ کر اندر چلی گئی۔ وہ آفس کے لیے تیار ہونے چل دی تھی۔



دو پہر سے پہلے ہی رضا ان کے ہاں چلا گیا۔ اس کا چہرہ کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔ بلقیس خاتون نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ اس دن فوراً ہی وہاں سے آگئیں۔ ورنہ میں جلد ہی آپ سے ملنے کے لیے آجاتا۔ دراصل مجھے آپ کو تلاش کرنا پڑا۔“ رضا نے بات کا آغاز کیا

”کیوں، کیوں تلاش کیا تم نے؟“ بلقیس بیگم کی آواز میں حیرت تھی جسے رضا کی تلاش سے کوئی سروکار نہ ہو۔

”ظاہر ہے آپ نے پاپا کے حوالے سے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے تو۔“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”دیکھو۔ میرا تعلق سلمان صاحب سے تھا۔ ان کے حوالے سے جتنے بھی تعلق ہیں۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، میں کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔“ اس نے اکتا ہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

”کیوں، ایسا کیوں، سوچ رہی ہیں آپ؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”تمہارے اس سوال سے تمہاری بے جا ضد ظاہر ہو رہی ہے۔ ہم اپنی زندگی میں خوش ہیں۔ پہلے کی طرح میں اب بھی گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ہنوز اکتا ہٹ ہی سے کہا

”دیکھیں، کسی سے تعلق رکھنا یا نہ رکھنا آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن آپ سلمان اشرف کی بیوہ ہیں، جو میرے پاپا ہیں۔“ وہ جذباتی انداز میں بولا تو بلقیس خاتون نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”دیکھو بیٹا! تمہارے پاپا سے میری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی، جنہیں بہر حال نارمل نہیں کہا جاسکتا۔ میرا ان سے شرعی نکاح تھا۔ اس نکاح کا کوئی دستاویزی ثبوت اگر تھا بھی تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ دو گواہ تھے، جن میں ایک زندہ ہے اور دوسرا فوت ہو گیا۔

”یہ کیسے ہوا؟ کیسے حالات تھے وہ، نکاح کیوں ضروری ہو گیا تھا؟“ اس نے اضطرابی انداز میں گئی سوال کر ڈالے تو بلقیس خاتون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں تمہارے ان سوالوں کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، اب کیا حاصل۔“

”نہیں، میں مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں میرے پاپا کی زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔“ رضا نے تیزی سے کہا، تب بلقیس خاتون کتنی دیر خاموش رہی پھر سمجھے ہوئے لہجے میں بولی تو کہتی چلی گئی۔

وہ نرس تھی اور ان دنوں اسے نرسنگ کرتے ہوئے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ جب سلمان اشرف ان کی گلی میں اپنے دوست کے پاس آن ٹھہرا تھا۔ سلمان اشرف پر ان دنوں کوئی مقدمہ تھا۔ وہ چھپنے کے لیے اپنے شہر سے اُن کے شہر میں آ گیا تھا۔ بلقیس خاتون کو وہ اچھا لگا اور وہ اس میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ ان دنوں اتنا امیر نہیں تھا تاہم اس کی شخصیت زیادہ جاذب نظر تھی۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آن پہنچی کہ انہیں شادی کر لینے کا احساس ہو گیا۔ مگر حالات ایسے نہیں تھے کہ ان کی شادی ہو سکتی۔ سو کسی بھی موقع گناہ سے بچنے کے لیے انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ خاموشی سے نکاح کر لیا جائے۔ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔ ان کا نکاح ہو گیا۔ وہ کچھ عرصہ یونہی رہے۔ اس دوران بلقیس خاتون کے ہاں زار یہ پیدا ہونے والی ہو گئی۔ پھر اچانک ایک دن سلمان اشرف کو وہاں سے نکلتا پڑا۔ بلقیس خاتون نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا اور وہ سلمان اشرف کا انتظار کرنے لگی۔ دو برس کے بعد وہ واپس آیا۔ تب پتہ چلا کہ جب ان دنوں کا نکاح ہوا تھا اس وقت اس کی پہلی شادی ہو چکی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بلقیس خاتون نے اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ تاہم غلط بیانی کے باعث اس نے سلمان اشرف سے قطع تعلق کر لیا۔ یوں دن گزرتے گئے۔ وہ اپنے شہر میں رہی اور سلمان اشرف اپنے شہر میں۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ یہاں تک کہ دو برس قبل وہ یہاں اس شہر میں آ کر آباد ہو گئے۔ جس کی وجہ زار یہ کی تعلیم تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ زار یہ کے لیے کچھ کر جاتے، وہ

اچانک دنیا چھوڑ گئے۔ ”مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ میری قسمت ہی ایسی تھی۔ اب مجھے کسی شے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زار یہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اب بس یہی میری تمنا ہے۔ اسے کسی بھی اچھے گھر میں رخصت کرنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔“ بلقیس خاتون نے بڑے سکون سے کہا۔

”اتنا کچھ..... مطلب پاپا نے.....؟“ رضانے تیزی سے پوچھا۔

”نہیں میں نے کہا نا تمہارے پاپا زار یہ کے لیے کچھ نہ کر سکے اور نہ ہی میں نے کبھی ان کی طرف سے دیا ہوا قبول کیا۔ میں نرسنگ کرتی رہی ہوں۔ میں نے اتنا کمایا ہے کہ باقی زندگی سکون سے بسر کر سکتی ہوں۔ میں اب بھی چاہوں تو بہت کچھ کما سکتی ہوں اور پھر زار یہ ایک برس سے نجی کمپنی میں ملازمت کر رہی ہے۔ اتنا کمالیتی ہے کہ ہم دونوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”کس کمپنی میں ملازمت کر رہی ہے؟“ رضا کے پوچھنے پر بلقیس نے کمپنی کا نام بتا دیا۔ وہ اٹنی مضبوط کمپنی تھی کہ ملازمین کو بہترین ادائیگی کر سکتی تھی۔ تاہم نچانے رضا کے دل میں ایسی کیا لہر ابھری۔ اسے یہ سن کر اچھا نہیں لگا تھا کہ زار یہ وہاں کام کرے۔ دونوں کے درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ اس خاموشی کو بلقیس خاتون ہی نے توڑا۔

”ممکن ہے تمہیں جو میں نے بتایا۔ اس سے تمہیں شک و شبہات کا احساس ہو۔ میری اس کہانی میں خامیاں اس لیے معلوم ہوں گی کہ بہت ساری کڑیاں غائب ہیں لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے تمہیں اطمینان دلانے کی یا اپنی کہانی سچ ثابت کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔“

”دیکھیں۔ آپ کو خواہش ہو یا نہ ہو لیکن میں اپنے پاپا کی زندگی سے جڑی ہر بات کو جاننا چاہتا ہوں۔ کم از کم مجھے تو مطمئن کریں نا آپ۔“ رضا کے لہجے میں ذرا سا غصہ جھلک رہا تھا۔

”رضا! میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔ مگر ایک شرط پر تمہارا اطمینان.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”آپ کوئی بھی شرط رکھیں میں مانتا ہوں۔“

”تو سنو۔ میرے پاس سلمان کی چند چیزیں ہیں، جن سے ہو سکتا ہے، تمہارا اطمینان ہو جائے۔ نہ بھی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”پاپا کی چیزیں..... مطلب.....؟“ وہ تجسس سے بولا۔

”ہاں۔ ان کی چیزیں، میں لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیڈر بیگ تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ لو۔ اس میں تمہارے پاپا کی وہ چیزیں ہیں جو میرے پاس نشانی کے طور پر رہ گئی تھیں۔ یہ بہر حال میرے لیے تو اثاثہ ہیں۔ تم انہیں لے جاؤ۔ کیونکہ ان چیزوں کی تصدیق فقط تمہاری ماما ہی کر سکتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ رضا بڑی گہری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔

”میں بہت جلد یہ چیزیں آپ کو واپس کر دوں گا۔“ رضانے کہا

”نہیں، تم ان کے حقیقی وارث ہو۔ انہیں لے جاؤ اپنے ساتھ۔ جب وہ نہیں رہے تو اب ان چیزوں کی اہمیت نہیں رہی۔ یہ میں تمہیں دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ یوں خاموش ہوئی جیسے خود پر قابو پا رہی ہو۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ”رضا! یہ ذہن میں رہے، میں جو تمہیں اطمینان دلا رہی ہوں اور یہ چیزیں سلمان کی بیوہ ثابت کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ مجھے نہ جائداد کی طلب ہے اور نہ یہ چاہوں گی کہ تم مجھے سلمان اشرف کی بیوہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرو۔ بس شرط یہی ہے۔“

ان کے درمیان ایک بے نام سی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ تب رضانی نے کہا۔

”زار یہ! میری بہن ہے۔ میں اب تک اس سے نہیں مل سکا، آپ اسے تو بلوائیں، میں اسے بات.....“

”اس سے مل کر تمہیں دکھ ہوگا۔ وہ تم سے شدید نفرت کرتی ہے۔“ بلقیس خاتون نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ وہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جس بچی نے اپنا بچپن انتہائی تنگی اور تنگدستی میں گزارا ہوا اور اسے احساس ہو کہ اس کے باپ کی اولاد عیش کر رہی سارا کچھ اس اولاد کے پاس سے تو بس کیا بتاؤں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو رضا کو بہت افسوس ہوا۔ پھر کافی دیر بعد بولا۔

”وہ گواہ، جو زندہ ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں بتا سکتی ہیں۔ کیا میں اس نے مل سکتا ہوں۔“

”میں نہیں جانتی اب وہ کہاں ہے، چند سال پہلے تک وہ اپنے آبائی گھر میں رہتا ہے۔ اب نجانے کہاں ہو۔ زندہ بھی ہے یا۔۔۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر معلومات دینے لگی۔ رضا نے غور سے سنا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ واپس آتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔



زار یہ اور عاتکہ دونوں اپنے آفس کے سامنے والے ریسٹوران میں بیٹھی لچ کر رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک برس کی رفاقت میں بہت گہری سہیلیاں بن چکی تھیں۔ پورے آفس میں یہ دونوں ہی تھیں جو الگ تھلگ بیٹھ کر راز و نیاز کر لیتی تھیں۔ انہیں دفتر کے باقی لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ لچ کے بعد سو ڈاڑھی رہی تھیں جب زار یہ نے پوچھا۔

”کیا بات ہے جو آج تم نے بڑے اہتمام سے مجھے لا کر یہاں لچ کروایا؟“

تب عاتکہ نے اس کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”زار یہ! میں چند دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں تم بہت اچھی ہوئی اور بے چین سی ہو۔ کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟“

”مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے عاتکہ۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں ٹکڑوں میں بٹ گئی ہوں۔ دل کی اپنی ضد ہے اور ذہن اپنی باتیں منوار رہا ہے۔ حالات کی نشاندہی ایک الگ سمت میں ہے اور میری خواہشیں مجھے کچھ اور ہی کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ میں حالات کے ایسے دوراں پر کھڑی ہوں، جہاں مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔“ زار یہ نے اچھے ہوئے انداز میں عجب سے لچے میں کہا۔

”اس انجھن کی وجہ فیصل تو نہیں ہے۔ اس سے کوئی بات۔۔۔۔۔“ عاتکہ نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں، وہ نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”تمہیں تو معلوم ہے وہ بے چارہ اپنا حال دل کہہ کر میری طرف سے اُمید لگائے ہے کہ میں اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں لیکن۔۔۔۔۔“

”یار مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اگر مجھ سے محبت کرتا ہے تو اس میں میرا کیا دخل، نہ میں اسے محبت کرنے کا کہتی ہوں اور نہ منع کرتی ہوں۔ اس کی مرضی، لیکن اگر مجھے اس سے محبت نہیں ہے تو میں کیوں مجبور ہو جاؤں“

”دیکھو۔ ایک لڑکی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے۔ وہ تمہیں ایسے ہی چاہتا ہے تمہیں اور کیا چاہیے۔ وہ ہنڈسم ہے، اچھے خاندان سے ہے۔ اس کی۔۔۔۔۔“ عاتکہ یوں بول رہی تھی جیسے وہ فیصل کی وکالت کر رہی ہو۔ اس پر زار یہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ یوں تھا جیسے بکھرتے ہوئے اسے اپنا آپ سمیٹنا اچھا نہ لگ رہا ہو۔

”مجھے تمہاری آج تک سمجھ نہیں آئی زار یہ۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس نے تجھے پسند کیا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ سو طرح کی خوبیاں ہیں اس میں۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور تم۔۔۔۔۔ تم کسی آئیڈیل کی تلاش میں ہو۔ خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ تمہارے سامنے جو دنیا ہے، وہی حقیقت ہے۔ کسی آئیڈیل کا مل جانا یہاں ناممکن ہے۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتی چلی گئی

”نہیں عاتکہ۔ میں نہیں مانتی۔ اس دنیا میں بھی آئیڈیل مل جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اپنا آئیڈیل۔“ وہ پر یقین لہجے میں بولی تو عاتکہ حیران رہ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ وہ سرسرا تے لہجے میں بولی

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر یہی بات تم چند دن پہلے سمجھانے کی کوشش کرتی تو ممکن ہے میں تمہاری بات مان لیتی مگر اب نہیں۔ میں نے اپنا آئیڈیل دیکھ لیا ہے اور بس! اب اسے پانا ہے۔“ اس نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ اس پر عاتکہ کتنی دیر خاموش رہی۔ پھر اجنبی سے لہجے میں بولی۔

”زار یہ! اتنی رفاقت کے باوجود، آج تم پہلی بار مجھے اجنبی سی لگی ہو۔ کہاں دیکھ لیا تم نے اپنا آئیڈیل؟“

”بس دیکھ لیا۔ اور جب اسے بالوں کی نا تو ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا۔ یہ وعدہ رہا عاتکہ، سب سے پہلے میں تمہیں بتاؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے نارمل ہو گئی۔ تب عاتکہ کو یوں لگا جیسے زار یہ کی ذہنی صحت پر اسے شک ہو گیا ہو۔ اس نے رसान سے کہا۔

”زار یہ! تم مجھے بہنوں کی طرح پیاری ہو۔ میں اب بھی تمہیں سمجھاتی ہوں کہ تم خواب در خواب میں نہ گرو۔ ورنہ حقیقی دنیا کی طرف

لوٹتے ہوئے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤ گی۔“

”پھر کیا ہوا۔ اگر میرے مقدر میں یہی لکھا ہے تو یونہی سہی۔ تم شاید اس تجربے سے نہیں گذری ہو۔ وہ خواب جو تم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے برسوں گزار دو اپنے آئیڈیل کی محبت تمہاری رگوں میں خون کی مانند شامل ہو جائے۔ اور وہ خواب اچانک تمہارے سامنے مجسم ہو جائے تو کیا تم اس کی محبت اپنے وجود سے نوچ کر پھینک سکتی ہو۔“ وہ خواب ناک لہجے میں کہتی چلی گئی۔ جس پر عاتکہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس لیے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا

”کون ہے وہ؟“

”کہنا نا، انجھی نہیں۔ میں اسے اپنے خوابوں طرح چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے پر اسرار لہجے میں کہا پھر چوتھے ہوئے بولی۔ ”ناراض مت ہونا۔ ہم سب کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب کسی گویا کی ہمت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان خوابوں میں ہماری پوری ذات عریاں ہو جاتی ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، سو جانے سے پہلے جو تم خواب دیکھتی ہو۔ وہ بتا سکتی ہو کسی کو؟“

”مم..... مجھے..... سمجھ نہیں۔ ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔“ سچ ٹائم کب کا ختم ہو گیا ہے آؤ۔“ عاتکہ نے پہلے ریٹ واپس پر وقت دیکھا۔ پھر میز پر پڑی اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زاریہ بھی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ابھی ہوئی تھیں۔



رضا کو اپنے پاپا کے بزنس کے بارے میں سمجھتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ وقت گذر گیا تھا۔ کس کو کیا دینا ہے اور کہاں سے کتنا لینا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیگر اسٹاف کے ساتھ فیض الدین نے اس کی بھرپور مدد اور رہنمائی کی تھی۔ جاکد اد کے معاملات چھیڑنے کے لیے اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت آفس ہی میں گذر جاتا۔ لندن والے کاروبار کے بارے میں وہ پوری طرح مطمئن تھا۔ وہ سب اس کے بزنس پارٹنر نے سنبھال لیا تھا۔ وہاں سے اچھی خبریں مل رہی تھیں، بظاہر وہ پرسکون تھا لیکن پاپا کے بارے میں انکشافات نے اس کے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ وہ اسے جلد از جلد حل کر لینا چاہتا تھا۔ اس دن رضا کی سامنے والی نشست پر فیض الدین بٹھا کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے کافی منگوائی اور آہستگی سے بولا۔

”فیض صاحب۔! چھوڑیں یہ کام۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی کہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فائل بند کی اور اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ رضا نے بلیقیں خاتون سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا کر اس گواہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو فیض نے کہا۔ ”تو پھر مل لیں اس سے۔ آپ وہ ایڈریس مجھے دیں میں تلاش کروالیتا ہوں۔“

”ہاں۔! آپ ایسا ہی کریں۔“ یہ کہہ کر اس نے فیض الدین کو معلومات دے دیں۔

چوتھے دن رضا اور فیض الدین اس گواہ کے پاس تھے۔ وہ گواہ اسپتال میں اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا۔ اس نے بڑے غور سے رضا کو دیکھا اور پھر ان کی آمد کا مقصد جان کر بولا۔

”اچھا تم ہوسلمان کے بیٹے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تمہارے باپ نے بلیقیں سے شادی کی تھی۔ شادی کیا تھی۔ بس یار مجبوری میں نکاح کیا تھا دونوں نے۔ پسند کرتے تھے ایک دوسرے کو۔ تب سلمان ہمارے پاس ہی ادھر رہتا تھا۔ بس پھر وہ اپنی مجبوری میں پھنسا ہوا اور وہ اپنی ضد پراڑی رہی۔ سلمان بے چارہ چلا گیا۔ ہم نے بھی چلے جانا ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی تمہارے باپ سے۔ مگر بے پڑی انا والی۔“ وہ اپنی رو میں پرانی یادیں کہتا چلا گیا تھا۔ شام تک وہ واپس اپنے شہر لوٹ آئے۔ اس گواہ نے بہت سی پرانی باتیں بھی بتائی تھیں۔ رضا تمام راستے وہی سوچتا رہا تھا۔ اتر پورٹ سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا دل بہت اداس تھا۔ وہ اپنے پاپا کے بارے میں یقین کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اب پل صراط کے جیسا مرحلہ درپیش تھا۔ اسے اب سارا کچھ اپنی ماما سے کہنا تھا۔ وقت آن پہنچا تھا، اب وہ اس وقت سے نگاہیں نہیں چرا سکتا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ اپنی ماما کو ڈرائنگ روم میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بلیقیں خاتون کا دیا ہوا بیگ تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے عام سے لہجے میں کہا

”ماما۔! اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ پاپا نے دوسری شادی بھی کر رکھی تھی تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا۔“

”کچھ بھی نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے، انہوں نے دوسری شادی نہیں کی ہوگی۔“ شبانہ بیگم نے اطمینان سے کہا۔
 ”وہ آپ سے چھپا بھی سکتے تھے؟“ رضا سوالیہ انداز میں بولا۔

”تم عورت کو نہیں سمجھتے بیٹا۔ اندازہ ہو جاتا ہے۔ خیر۔ معاملہ کیا ہے؟“

تب رضا نے قبرستان میں ہونے والا واقعہ پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔ وہ ایک ایک لفظ غور سے سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔

”اگر اس عورت نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے تو اس کے پاس ثبوت بھی ہوگا۔“ شبانہ بیگم نے سکون سے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“ رضا نے کہا اور بیگم میں موجود ساری چیزیں اپنی ماما کے سامنے ڈھیر کریں۔ پھر اس کے ساتھ ہی بلقیس خاتون کے ساتھ ہونے والی ملاقات کا احوال سنا دیا۔ سب کچھ سن کر ماما نے گہرا سانس لیا اور پھر بولیں۔

”یہ سچ ہے بیٹا کہ تمہارے پاپا ان دنوں مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔ جب تمہیں پیدا ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ان پر غم اور فراڈ کا الزام تھا جو ان کے بزنس پارٹنر نے ان پر لگا دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر چھپتے پھرتے رہے تھے۔ بڑے سخت دن گزارے تھے انہوں نے۔ بعد میں تمہارے پاپا سچے ثابت ہوئے۔ جس شہر اور جگہ کا نام تم بتا رہے ہو۔ تمہارے پاپا نے وہاں بھی تھوڑا وقت گزارا ہے۔“

”اور یہ چیزیں؟“ رضا کا دماغ انہی میں اٹکا ہوا تھا۔

”یہ خط تمہارے پاپا ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ خط تو میرا ہے جو میں نے تمہارے پاپا کو لکھا تھا۔ یہ کتابیں اور ان پر دستخط، یہ انہی کے ہیں۔ یہ شرٹ ان کی ہے جو میں نے بنوائی تھی۔ یہ ان کے نام والا سگریٹ کیس اور لائینر..... یہ فرانس سے لیا تھا۔ میں ساتھ تھی اس وقت۔ لیکن یہ تو بہت عرصے بعد خریدا گیا تھا۔ اور یہ تازہ تصویر.....“ وہ کہتے ہوئے رک گئیں۔

”یہ ادھیڑ عمر بلقیس خاتون ہے۔ یہ دائیں طرف زار یہ ہے اور درمیان میں پاپا۔ تصویر میں پس منظر تو ادھر ہمارے شہر ہی کا ہے۔ وہ بعد میں بھی ملتے رہے ہیں ان سے۔ یہ دونوں پچھلے دو برس سے ادھر ہیں۔ یہ تصویر یہی بتا رہی ہے۔“ رضا نے تفصیل سے کہا تو شبانہ بیگم سوچتے ہوئے بولیں۔

”رضا۔! اس عورت کو جانداد سے کوئی سروکار نہیں اور وہ اپنا تعلق بھی ثابت کر رہی ہے۔ تم اس گواہ سے ملے ہو۔“

”ہاں۔ آج ہی ملا تھا۔ اس نے بھی تصدیق کر دی ہے۔“ رضا نے اپنی ماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سکون تھا۔

”تو پھر کیا کہتے ہو تم؟“ وہ دھیرے سے بولیں۔

”ماما۔! ثبوت اور شواہد تصدیق کر رہے ہیں کہ پاپا نے شادی کی، بلقیس خاتون ان کی دوسری بیوی اور زار یہ ان کی بیٹی یعنی میری بہن ہے۔ آج نہیں تو کل سب کو یہ معلوم ہو جائے گا اور.....“

”دنیا کی فکر چھوڑو، اپنی کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شبانہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”ماما۔! وہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرض کریں اگر وہ جانداد وغیرہ کے مقدمہ وغیرہ بھی کرتی ہیں تو پاپا کے نام کا حوالہ آئے گا۔ جیسے ہم تسلیم ہی نہیں کریں گے۔“ رضا نے سمجھایا۔

”اور دوسرا رستہ؟“ شبانہ بیگم نے پوچھا۔

”ہم انہیں تسلیم کر لیں اور اگر آپ کی اجازت ہو تو انہیں اس گھر میں لے آئیں۔ اور پھر جو ان کا حق بنتا ہے وہ انہیں دے دیں۔ زار یہ محض بلقیس خاتون کی بیٹی نہیں، سلمان اشرف کی بھی ہے۔ اور رضا سلمان کی بہن۔ اسے معاشرے میں وہی عزت اور مان ملنا چاہئے جو سلمان اشرف کی بیٹی اور رضا کی بہن کا ہو سکتا ہے۔“ رضا نے پر جوش انداز میں اپنی بات ختم کی تو شبانہ بیگم چند لمحے خاموش رہیں اور پھر بڑے کبیر لہجے میں بولیں۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن، اگر میں کہوں کہ چند دن صبر کرو اور ان سارے معاملات کو اچھی طرح دیکھو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاپا نے یہ جانداد کس طرح بنائی ہے۔ اگرچہ وہ وراثت میں کچھ حاصل نہیں کر سکتے لیکن آخرت میں ہماری جواہد ہی ہے۔ جو ان کا حق بنتا ہے۔ وہ انہیں ضرور دو کیونکہ انہیں جو کچھ ملنا ہے۔ وہ تم اپنی ذاتی جانداد میں سے دو گے جو تمہارا باپ تمہارے لیے چھوڑ گیا ہے۔ وہ یہاں آ کر رہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ جہاں تم رہو۔ میں بھی وہیں رہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنا ہے۔ یہی میری خواہش ہے۔ زندگی کے یہ آخری لمحوں میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں میرے بیٹے۔“ شبانہ بیگم نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ رضا کا دل بھر آیا تھا۔

”ماما۔! کیا آپ نہیں سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہنے کی کتنی بڑی خواہش اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خیر! میں نے یہی پلان کیا ہوا ہے میں آپ کو لے کر لندن چلے جانا ہے۔ یہاں بزنس چلتا رہے گا۔ یہ تو ہونا ہی ہے۔ فی الحال تو بلیکس خاتون کو منانا ہے۔ اس لیے جیسا آپ کہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”زار یہ کیا کہتی ہے؟“ ماما نے پوچھا۔

”میری ابھی تک اس کے ملاقات نہیں ہو سکی، بلکہ ایک لفظ تک کا تبادلہ ہمارے درمیان نہیں ہوا۔ وہ کیا سوچ رہی ہے مجھے قطعاً معلوم نہیں۔ میں ایک دو دن میں ہی اس سے ملوں گا۔“ وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”جو تمہارا دل چاہے کرو میرے بیٹے۔ یہ سارے معاملات جلد از جلد ختم کرو، تاکہ میں تمہاری دہن لانے کا ارمان پورا کر سکوں۔“ شبانہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ متناہی بھیگا ہوا تھا۔

”معاملات تو چلتے رہتے ہیں۔ آپ نے جو کرنا ہے کریں۔ جتنے ارمان نکالنے ہیں نکال لیں۔“ اس نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ تو شبانہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جس سے رضا کا دل خوشی سے بھر گیا۔

رضا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماما اتنی جلدی مان جائیں گی۔ لیکن جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بس اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش تھیں۔ سو ایک دن اس نے فیض الدین سے کہہ دیا۔

”فیض صاحب۔! میرے خیال میں اب ہمیں پاپا کی جائیداد والا معاملہ بھی حل کر لینا چاہیے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔ میرا نہیں خیال کہ اس میں کوئی الجھن ہے۔ وراثت تو آپ اور بیگم صاحبہ کے نام منتقل ہونی ہے۔ اور بس، ہماری کمپنی کے وکیل چند دنوں میں یہ مکمل کر لیں گے۔“ فیض نے عام سے انداز میں کہا

”ٹھیک ہے، لیکن بلیکس خاتون اور زار یہ کو اتنا ہی ملنا چاہیے جتنا ان کا حق بنتا ہے۔ آپ فرض کر لو کہ وہ بھی وراثت میں حصے دار ہیں۔“ رضانے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”وہ قانونی یا وراثتی حقدار نہیں ہیں۔ اس لیے قانونی طور پر جائیداد آپ کے نام ہوگی۔ پھر آپ جو چاہیں انہیں دے دیں۔“ فیض الدین نے وضاحت کی۔

”وہ صورت کوئی بھی ہو۔ اس جائیداد اور اثاثوں میں جو شرعی حق بنتا ہے۔ وہ انہیں پورا پورا ملنا چاہئے۔ آپ کاغذات تیار کروائیں۔ میں بلیکس خاتون سے بات کر لیتا ہوں۔“ رضانے حتمی انداز میں کہا۔

”جی۔ چند دن میں یہ سارے قانونی مراحل طے ہو جائیں گے۔ میں کاغذات تیار کروا دیتا ہوں۔“ فیض نے کہا تو رضا بڑی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اب اسے فقط بلیکس خاتون کو منانا تھا کہ وہ ان کے ساتھ آ کر رہے۔ لیکن ایک جھجھن اب بھی اس کے دماغ میں تھی کہ زار یہ اس سے بات کیوں نہیں کرتی۔ کبھی اس نے ملنے کی خواہش نہیں کی؟ وہ یہ سب سوچتا، پھر خود ہی اپنے آپ کو یہ جواب دے کر مطمئن کر لیتا

کہ چند دن بعد جب میں انہیں ان کا حق دے دوں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ رضا اس کا بھائی ہے کوئی غیر نہیں۔ تب تک اگر وہ نہیں بھی بات کرتی تو کوئی مسئلہ نہیں۔

رضا چند دن تک اپنی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کے لیے پاپا کی شخصیت آئیڈیل رہی تھی۔ اگرچہ اس کا زیادہ وقت والدین سے دور رہتے ہوئے گزرا تھا اور وہ اپنے پاپا کو اتنے قریب سے بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن پاپا کے بارے میں انکشافات نے اس کے اندر بالکل مجادی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہی کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اس کہانی میں موجود ایک ایک کردار کا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی تو اسے پاپا کی دوسری شادی محض اس لیے اچھی لگتی کہ انہوں نے یہ سب راز میں رکھا۔ اگر وہ اعلانیہ شادی کر لیتے تو اسے اتنا زیادہ دکھ نہ ہوتا۔ اور پھر رضا کو کبھی کبھی اپنے پاپا پر ڈھیروں پیار آ جاتا کہ ہمیں دکھ نہ دینے کے باعث انہوں نے یہ سب چھپائے رکھا۔ اسی جمع تفریق میں آخر کار اسے پاپا حق بجانب لگتے۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں، انہوں نے ضرورت محسوس کی اور کر لی۔ پھر بلیکس خاتون کا اطمینان اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ زندگی کے معاملات جیسے بھی رہے ہوں۔ دنیا داری کی ضرورت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ ممکن ہے پاپا ان کے لیے اتنا کچھ کر گئے ہوں کہ اب وہ مزید ضرورت محسوس نہ کرتی ہو۔ کیا یہ اطمینان اور قناعت پسندی حقیقت ہے، محض دکھاوا ہے یا پھر کوئی مجبوری؟ اس کے سامنے سوالیہ نشان تن جاتے اور اس کی سوچیں ٹھٹھک جاتیں۔ تب خیال نئے راستے بنا لیتا۔

وہ اکلوتا تھا۔ اس نے بہن بھائی نہیں دیکھے تھے۔ قدرت نے اگر اسے ایک بہن دے دی تھی تو اسے اپنی بہن کو پوری عزت اور مان دینا

چاہئے۔ اس کی ذاتی جذباتی خواہش اپنی جگہ، لیکن زاریہ کی رگوں میں اس کے باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ سلمان اشرف کی بیٹی کے بارے میں آج اگر چند لوگوں کو معلوم ہے تو کل جب بات پھیلے گی، تب کیا ہوگا؟ جس طرح وہ خود پاپا کی دوسری شادی کا سن کر ہل گیا تھا۔ جذباتی وابستگی کے باوجود شک میں تھا۔ جبکہ حالات کی کڑیاں بھی درمیان سے غائب تھیں۔ ایسے میں بات پھیلی تو کتنے رنگین افسانے منظر عام پر آکر پھیل جاتے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاپا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، ان کی ذات منفی تاثر کا محور بن جانی۔ لوگوں کو بحث کے لیے پتھارے دار موضوع مل جاتا۔ وہ اور اس کا خاندان بدگمانی سے لے کر جگ ہنسائی کے گرداب میں پھنس جاتا۔ زاریہ جس کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔ وہ ان کے پھیلے ہوئے بزنس کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ جیسے ہی سلمان اشرف کا حوالہ زاریہ کی ذات کے ساتھ جڑتا تو اس کے تعارف کا حوالہ یہی بنتا۔ زاریہ کی ذات پر شک کیا جاسکتا تھا۔ اس شک کا مطلب اس کے باپ کی کردار کشی تھی۔ رضا سلمان کی بہن کا شک زدہ وجود، وہ کس کھاتے میں رکھتا، ایک دم سے رضا کو اپنے ارد گرد کا ماحول زہر آلود دکھائی دینے لگتا۔

زاریہ کے پارے میں سوچتے ہوئے وہ متضاد خیالات میں گھر جاتا۔ وہ ایک بار دکھائی دینے کے بعد پھر نظر نہیں آئی تھی۔ کیا وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتی یا اس نے دل میں ایک بھائی کے لیے جذبات ہی نہیں ہیں؟ یہ سوال ایسی چھین کی مانند تھے جو اس کے دماغ میں بے چینی بھر دیتے۔ فطری وابستگی کا احساس اور جذباتی خواہش کے علاوہ جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اس مسئلے کا سیدھا سادہ حل یہی تھا کہ وہ بلقیس خاتون سمیت زاریہ کو اپنے گھر میں لے آئے۔ انہیں وہ عزت اور مان دے جو ان کا حق ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان دونوں کے ذکر پر اس کی ماما خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ جیسے وہ انہیں پسند نہ کرتی ہو۔ یہ ایک فطری رد عمل تھا۔ دوسری جانب بلقیس خاتون کا رویہ بے پروائی والا تھا۔ یہ معاملہ کیسے حل ہوگا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ وہ محض سوچ کر رہ جاتا۔

اس دن عاتکہ اپنی میز پر بڑی پریشان اور افسردہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کئی بار دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں موجود فیصل سے بات کرنے کے بارے میں سوچ چکی تھی۔ مگر ہر بار فطری جھجک اسے روک لیتی۔ اسی کشمکش میں لچ ٹائم ہو گیا۔ اس نے بے دلی سے اپنا لچ بکس لیا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف فیصل ہی تھا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا

”کیا خیال ہے عاتکہ، آج لچ سائمنے والے ریسٹوران میں نہ لیں۔“

”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں زاریہ کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”تو پھر آؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی ریسٹوران میں پہنچے۔ وہ رش سے ہٹ کر اوپن ایر میں چھتری تلے آ بیٹھے تو عاتکہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میں آج صبح ہی سے ملنا چاہ رہی تھی..... وہ زاریہ.....“

”ہاں آج تیسرا دن ہے وہ نہیں آئی، اس کا سیل فون بھی بند ہے۔ خیریت تو ہے نا۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”مجھے اس کے بارے میں معلوم نہیں لیکن میں پریشان ضرور ہوں۔“ وہ بولی

”وہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔“ اس نے انتہائی بے تابی سے پوچھا۔ جس پر وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی

”برسوں جب وہ نہیں آئی تو میں نے اسے فون کر کے نہ آنے کی وجہ پوچھی، اس نے کوئی خاص وجہ نہیں بتائی، لیکن وہ پریشان تھی۔ اچھی ہوئی تو وہ کئی دنوں سے تھی۔ عجیب اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی تھی وہ۔ پتہ نہیں کیا معاملہ چل رہا ہے اس کے ساتھ۔ خیر اس نے کوئی وجہ بتائے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کا پیغام (ایس ایم ایس) میرے سیل فون پر آ گیا۔

”کیا تھا وہ پیغام۔“ اس کی بے تابی حد درجہ بڑھ گئی تھی۔

”یہی کہ اگر میرے بارے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو فوراً اس نمبر پر بتا دینا۔ وہ کسی رضا سلمان نامی شخص کا تھا۔“

”تمہیں معلوم ہے یہ کون شخص ہے۔“ اس نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

”نہیں، میں نہیں جانتی۔ اور نہ ہی پہلے کبھی اس کا ذکر کیا تھا۔“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنا سیل فون نکال کر بولی۔ ”وہ

پیغام میں تمہیں فاروڈ کر رہی ہوں۔“

”کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟“ اس کی سوئی وہیں انک گئی

”میں نے اسی وقت زاریہ سے پوچھنا چاہا تھا مگر اس وقت میں مصروف تھی۔ میں نے سوچا، بعد میں معلوم کرتی ہوں پھر اس کے بعد

اس کا بیل فون ہی آف جا رہا ہے۔“

”کیا خیال ہے پھر، اس سے زیادہ غیر معمولی بات کیا ہوگی۔ وہ تین دن سے غائب ہے، بیل فون بند ہے۔ کوئی رابطہ، کوئی اتنا پتہ نہیں۔“ اس نے تشویش سے کہا۔

”میں تم سے یہی تو مشورہ کرنا چاہ رہی تھی کہ کیا میں اس نمبر پر اطلاع دے دوں یا ہمیں کچھ اور کرنا چاہیے۔“
”تم اس نمبر پر اطلاع دو۔ ابھی اور اسی وقت۔ دوسرا ہمیں خود اس کے بارے میں پتا کرنا چاہیے۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا۔
”میں ابھی اس نمبر پر کال کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کال ملانے لگی، چند لمحوں میں اس کا رابطہ ہو گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرا کے زاریہ کے بارے میں بتا دیا۔ فون بند ہوتے ہی فیصل نے پوچھا۔

”تمہیں اس کے گھر کا معلوم ہے نا؟“ اوچلیں۔ اس کا پتہ کرتے ہیں۔“
”آفس ٹائم میں تو ممکن نہیں بعد میں چلتے ہیں۔“ اس نے بہانہ بنا کر ٹال دینا چاہا تو وہ فوراً بے چین ہوتے ہوئے بولا۔
”تم فکر نہ کرو باس کو اعتماد میں لے کر باقی وقت کی چھٹی میں لے لیتا ہوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے اور پھر تجھے ڈراپ بھی کر دوں گا۔“ اس پر عاتکہ نے چند لمحے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دو پہر ڈھلنے والی تھی جب وہ زاریہ کے گھر کے سامنے پہنچے۔ عاتکہ نے گاڑی سے اتر کر بیل دی اور انتظار کرنے لگی، پھر کافی دیر تک بیل دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا، جیسے گھر میں کوئی مکین نہ ہو۔ فیصل بھی گیٹ تک آ گیا تھا تو عاتکہ بڑبڑاتے ہوئے بولی
”کہیں وہ اچانک چلے نہ گئے ہوں؟“

”میرے خیال میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔“ وہ یوں بولا جیسے اسے کسی گڑبڑ کا یقین ہو۔
”اب کیا کیا جائے۔“ وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک قیمتی گاڑی ان کے پاس رکی، اس میں سے رضا باہر آیا۔ اس کے ساتھ دو لوگ اور بھی تھے۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑے رہے۔ جبکہ ان کے درمیان تعارف کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اور صورت حال بھی واضح ہو گئی۔
”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ زاریہ اور اس کی والدہ دونوں کا فون بند ہے۔“ رضا نے کہا اور ساتھ آئے ہوئے آدمیوں سے کہا کہ وہ گیٹ کا لاک توڑ دیں۔

”ایسے کیسے ہم کسی کے گھر کا تالہ توڑ سکتے ہیں۔ یہ غیر قانونی ہے اور۔“
”میں سب سنہال لوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہوئی ہے۔“ رضا نے براعت دلچے میں کہا۔
تالا توڑا کر رضا گھر کے اندر چلا گیا۔ فیصل بڑھا تو عاتکہ کو بھی ناچار اندر جانا پڑا۔ اندر پر ہول سنا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر کھرا ہوا سامان کچھ اور ہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک کمرہ دیکھتے ہوئے زاریہ کے کمرے میں جا پہنچے۔ جہاں کا منظر دیکھ کر وہ تینوں ہی دم بخود ہو گئے۔

زاریہ قایلین پردائیں کروٹ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ رپیرنا کیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ سوچے ہوئے ہونٹ، چہرے پر خراشیں اور کنپٹی کے پاس سے خون بہہ کر سوکھ گیا تھا۔ ہلکے کاسنی رنگ کا لباس کہیں سے ملا ہوا اور کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر اچھا خاصا تشدد کیا گیا ہے۔ اس وقت ان تینوں کے ذہن ایک جیسا سوچ رہے تھے کہ وہ زندہ بھی ہے یا سامنے بے جان جسم پڑا ہے۔ رضا ناقابل یقین انداز میں اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ شدید ترین دکھ کی کیفیت سے گذر رہا ہو۔ جبکہ فیصل لمحہ بھر دیکھنے کے بعد بے تابانہ اس کی طرف بڑھا اور نبض ٹٹولنے لگا۔ چند لمحوں میں کئی رنگ اس کے چہرے پر سے گذر گئے۔ پھر اچانک خوشی بھرے لہجے میں تھر تھراتے ہوئے بولا۔

”زندہ ہے زاریہ زندہ ہے عاتکہ پانی لاؤ۔“
اس کے یوں کہنے پر وہ دونوں جیسے ہوش میں آ گئے۔ رضا نے فوراً اس کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ عاتکہ پانی لے کر آئی اور چھیننے اس کے منہ پر مارنے لگی۔ زاریہ کے بدن میں ہلکی سی تھر تھراہٹ پیدا ہوئی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ اس نے کوشش جاری رکھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہونٹوں کی طرح ان کی طرف دیکھنے تو لگی لیکن یوں جیسے اسے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ہونٹوں سے سرسراہٹ ہی نکل رہی تھی۔ وہ اسے پوری طرح ہوش میں لانا چاہ رہے تھے۔ مگر انہیں کامیابی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس دوران چند پولیس

والے بھی آگئے لیکن وہ پوری طرح ہوش میں نہ آسکی۔ البتہ اس کی سرگوشی، بڑبڑاہٹ میں بدل گئی تھی۔ تینوں نے بہت غور سے سنا تو سمجھ میں آیا، وہ کہہ رہی تھی۔

”میں رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔“

رضا پر حیرت ٹوٹ پڑی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ مگر وہ ایسا وقت تھا کہ اس سوال پر زیادہ سوچا نہیں جاسکتا تھا۔

”فیصل، میں زار یہ کو اسپتال لے کر جا رہا ہوں، تم ان پولیس آفیسر کے ساتھ رہو۔ میرے لوگ بھی یہیں ہیں۔ آؤ عاتکہ۔“ رضا نے کہا اور پھر زار یہ کو اٹھا کر گاڑی تک لے گیا۔

زار یہ کو انتہائی نگہداشت وارڈ میں پوری ایک رات گزر گئی تھی۔ شام ہوتے ہی عاتکہ اپنے گھر چلی گئی اور فیصل پولیس کی کے بعد وہاں سے سیدھا اسپتال آ گیا تھا۔ رضا اور فیصل کو جاتے پوری رات ہو گئی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر زار سے پوری طرح ہوش میں لانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ رضا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوا؟ تاہم زار یہ کا گاہے بگاہے ایک ہی فقرہ بڑبڑانا اسے سرتاپا ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ زار یہ کس دھوکے کی بات کر رہی ہے؟ اس کی یہ حالت کیسے ہونی اور کس نے کی؟ بلقیس خاتون کہاں ہے؟ ان پر یہ افتاد کیا آن پڑی؟ کیا یہ زار یہ کے قتل کی کوشش تھی یا کوئی اور ہی معاملہ تھا؟ کیا بلقیس خاتون قتل ہو گئی ہے یا وہ اغواء ہو چکی ہے اس کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ پریشانی کی انتہا پر تو تھا ہی لیکن ان سوالوں پر وہ جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا اطمینان انہی سوالوں کے جواب میں تھا جو اس کے لیے اب راز کی مانند بن گئے تھے۔ اس راز کو فقط زار یہ ہی کھول سکتی تھی اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں تھی۔ اس وقت سورج طلوع ہونے کو تھا جب سینئر ڈاکٹر نے انہیں اپنے کمرے میں بلا یا۔ وہ دونوں ہی چلے گئے۔

”رضا صاحب۔! مریضہ ہوش میں تو آ جاتی ہے لیکن کوئی ایسی دماغی پیچیدگی ہے جس کے باعث وہ پوری طرح حواسوں میں نہیں آ رہی۔ میری اس بات کی تصدیق اس کی بڑبڑاہٹ ہے جس کے بعد وہ پھر سے ہوش میں نہیں رہتی۔ معاملہ خاصا سنجیدہ ہو گیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا تجویز ہے۔“ رضا نے پوچھا

”میں نے اپنی ڈاکٹر زلی ٹیم کے ساتھ بھرپور کوشش کی ہے اور کر بھی رہا ہوں۔ لیکن میں اس حق میں بھی نہیں ہوں کہ ایسے پیشہ کو زیادہ دیر رکھ کر رسک لوں۔ اس پر تشدد بھی خاصا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے دماغی پیچیدگی ہو گئی ہو۔“

”آپ جو بہتر سمجھیں ہیں بتائیں۔ میں انتظام کر لیتا ہوں۔“ رضا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی مزید ایک دو دن دیکھتا ہوں۔ مزید رپورٹس آ جائیں تو ماہرین سے مشورہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس دوران کوئی بہتر صورت نکل آئے۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے لندن بھی لے جاسکتا ہوں۔“ رضا نے ایک خیال کے تحت کہا تو ڈاکٹر بولا۔

”وہاں بہر حال سہولیات زیادہ ہیں۔ ایسا ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ لیکن دو دن تک مجھے کوشش کر لینے دو۔“ پھر مزید تھوڑی باتوں کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ آئے۔ وہ دونوں انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی طرف آئے تو سامنے شبانہ بیگم اپنی گھریلو ملازمہ سے ساتھ کھڑی ہوئی۔

”اما آپ.....! آپ کو کیسے پتا؟“ رضا نے پوچھنا چاہا تو شبانہ بیگم نے ہاتھ سے اشارے کے روکتے ہوئے کہا۔

”مجھے کل شام ہی سے معلوم ہے۔ میں نے سوچا کہ رات بھر میں کسی وقت زار یہ ٹھیک ہو گئی تو اسے تم گھر لے آؤ گے، مگر لگتا ہے معاملہ خاصا سیریس ہے، خیر۔! تم ایسا کرو۔ گھر جاؤ اور آرام کرو، میں ہوں یہاں پر۔“

”اما! آپ یہاں کیسے مطلب.....“ رضا نے جذباتی انداز میں کہا۔

”میں سنہیال لوں گی سب میرے ساتھ یہاں ڈرائیور ہے اور یہ رانی ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔ ورنہ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ شبانہ بیگم نے اعتماد سے کہا تو وہ گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ فیصل بھی اپنے گھر چلا گیا۔

رضا اپنے بیڈ پر پڑا کئی ساری سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کل سہ پہر سے لے کر اب تک کی جو صورت حال تھی۔ اس کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ اسے سمجھ آ رہی تھی تو فقط ایک بات کی کہ کسی بھی طرح زار یہ کا بچ جانا ضروری ہے۔ تب ہی ہر بات واضح ہو گئی ورنہ ہر معاملہ ایسی تاریکی میں کھو جائے گا کہ پھر تلاش کرنے کے باوجود بھی ہاتھ نہیں لگنے والا تھا۔ کیونکہ باوجود انتہائی کوشش کے بلقیس خاتون کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔

اگلا پورا ہفتہ زاریہ کی حالت بتدریج بہتر ہوئی۔ اس کی بڑ بڑا ہٹ بند ہو گئی تھی اور وہ بے چینی بھی ختم ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ مسلسل تھی۔ وہ خواب آور ادویات کے زیر اثر دنیا و منہیا ہے بے خبر پڑی رہتی تھی۔ ڈاکٹر ز کو امید ہو گئی تھی کہ وہ صحت یاب ہو جائے گی۔ اگرچہ اس کی دماغی پیچیدگی کی وجہ سے سر پر لگنے والی چوٹ بھی تاہم وہ ایسے دکھ کی کیفیت سے بھی گزری تھی جس کا شاک وہ برداشت نہیں کر پائی تھی۔ اب وہ کب تک ٹھیک ہو پائے گی۔ یہ حتی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کبھی بھی اچانک وہ اپنے حواسوں میں آسکتی۔ تب کوشش کی جائے کہ اسے دوبارہ کوئی ذہنی شاک نہ لگے۔ رضا کے لیے یہ صبر آزمائیاں تھیں۔ کیونکہ زاریہ کے علاج میں صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس دوران سب سے زیادہ خیال شبانہ بیگم ہی نے رکھا۔ فیصل اور عاتکہ برابر آتے تھے اور بہت وقت گزارتے۔ وہ خود آفس میں بیٹھا ماما سے رابطے میں رہتا تھا۔ رضا نے زاریہ کے ارد گرد کئی لوگوں کا پہرا بٹھا دیا تھا کئی خواتین خدمت گار مقرر کر دیں۔ وہ خود شام ڈھلے اس کے پاس جاتا اور پھر رات گئے لوٹ آتا۔

پولیس کی روایتی تفتیش جاری تھی۔ ان کے مطابق یہ ذہنی ہی کی واردات تھی۔ جبکہ بلقیس خاتون کی گم شدگی ایک معمہ بن گئی تھی۔ پولیس کی کارروائی کچھوئے کی مانند تھی۔ رضا کی توجہ اس طرف بھی تھی کہ بلقیس خاتون کا جلد از جلد پتہ مل جائے۔ لیکن کامیابی نہیں ہو پارہی تھی۔ انہی دنوں فیض الدین چٹھیاں لے کر چلا گیا۔ اس کے کچھ خاندانی مسائل ایسے آگئے تھے کہ جنہیں پنپانا بہت ضروری تھا۔ وہ دوہنی چلا گیا۔ اگلے ہفتے میں اس نے واپس آ جانا تھا۔ رضا کے پاس دوسرے بہت سارے لوگ تھے۔ اس نے پولیس تفتیش کے سارے معاملات وکلاء کے ذمے لگا دیئے اور اپنی توجہ زاریہ پر لگا دی۔



زاریہ خواب ناک کیفیت میں تھی۔ سرمئی بادلوں سے بھرا آسمان اور سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اس کے سامنے تھے۔ بادل اس کے قریب سے یوں گزر رہے تھے جیسے وہ خود بادلوں میں تیر رہی ہو۔ وہ خود ایک پہاڑی کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس کا سفید لبادہ تیز چلنے والی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے وادی میں کچھ فاصلے پر کھریل اور زمین کی چھتوں والے مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے گھر تھے۔ پوری وادی پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی یوں جیسے سارے موسموں کے پھول یہیں اُگ آئے ہوں۔ وہ کھلی آنکھوں سے سرمئی بادلوں سے ڈھکے آسمان پر دھنک دیکھ رہی تھی۔ وہ انتظار والی کیفیت میں تھی، جیسے کوئی اچانک آنے والا ہے، جو اسے دورانِ فراق میں موجود دھنک تک لے جا کر جھولا جھلانے والا ہے۔ اگرچہ انتظار کی یہ کیفیت انتہائی طویل اور تکب بھری تھی لیکن اس پر خیار بھی تھا جیسے یہی کبک بھر انتظار اس کا حاصل ہو۔ تب اچانک سرمئی بادل اجنبی لگنے لگے۔ دھنک کے درمیان بجلی کڑکنے لگی۔ چکا چوندا تھی تھی کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ پائی۔ اچانک تیز ہوانے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ وادی میں گرتی چلی گئی۔ جیسے کوئی پیراشوٹ سے زمین پر آ رہا ہو۔ اسے لگا کہ وہ اپنے ہی بیڈروم میں آن گری ہے۔ بھی دروازہ کھلا اور بلقیس خاتون اندر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک طویل قامت ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جس سے وہ صرف ایک یارل چکی تھی۔ اب اسے وہ دوسری بار دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر غصہ، کڑختی اور جھلاہٹ تھی۔ جبکہ وہ اپنے فیصلے کی وجہ سے مطمئن تھی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ تب بلقیس خاتون کبھی چلی گئی۔

”دودن ہو گئے مجھے اس لڑکی کو سمجھاتے ہوئے مگر یہ نہیں سمجھ رہی۔ ایسا تو گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا اور اسے حقیقت میں بدلنے کے لیے جتنی ہم نے تگ و دو کی، آخری لحات میں آ کر وہ سب خوفناک حالات میں بدل دے گی یہ لڑکی“

”اسے ہوا کیا ہے، پاگل ہو گئی ہے؟“ وہ شخص بولا

”مجھے نہیں معلوم، میں تو دماغ کھپا کھپا کے تھک چکی ہوں، خود ہی پوچھ لو۔“ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی تو اس شخص نے زاریہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تمہیں ہوا کیا ہے، دودن پہلے تک تو تم ٹھیک تھیں۔ یہ اچانک کیا ہوا؟“

”میں اس معصوم رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ تم لوگ بہت بڑے فراڈ ہو۔“ زاریہ نے اطمینان سے کہا۔

”یہ تب سوچنا تھا جب تم اس پلان میں شامل ہوئی تھیں۔ ایک عام لڑکی سے زاریہ یہ سلمان بنانے میں مجھے بھاری رقم خرچ کرنا پڑی ہے۔ کاغذی ثبوت بنانے سے لے کر تمہارے رہن سہن تک، یہ تم جانتی ہو۔ اب جبکہ جا کدا تمہارے نام ہو رہی ہے۔ اس کے کاغذات تمہیں ملنے والے ہیں۔ عیش بھری زندگی تمہاری منتظر ہے تو پھر۔“

”اسے یہ بھی بتاؤ کہ رضا مستقبل میں چاہتا کیا ہے؟“

”وہ تم دونوں کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ گھر مطلب، کروڑوں کا بنگلہ اور خود وہ ماں بیٹا یہاں سے چلے جائیں گے۔ پھر کاروبار تیرا اور تو اس کے ساؤ سفیدی مالک۔ اتنی دولت تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے جو کرنا ہے وہ کرو۔ مجھے وہی ایک عام سی لڑکی بنا کر میرے حال پر چھوڑ دو۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

”ایویں چھوڑ دیں۔ تم ہمارے پلان کا حصہ ہو۔ اگر تم نہ رہی تو سب ختم۔ تمہارا یہ نالک اگر ہمیں بلیک میل کرنے کے لیے ہے تو سن لو۔ تم بھی ہمارے ساتھ مجرم ہو۔ ہمارے ساتھ تم بھی گرفت میں آ جاؤ گی۔ کون اعتبار کرے گا تم پر۔“ وہ شخص غراتے ہوئے بولا تو بلقیس خاتون نے کہا۔

”دیکھو زاریہ۔! ایک طرف عیش کی زندگی ہے۔ سکون سے زندگی گزارو۔ دوسری طرف موت ہے۔ آج تم ہمیں دھوکا دے سکتی ہو تو کل ہمارے بارے میں سب بتا سکتی ہو۔ اب یہ رسک تو نہیں لیا جاسکتا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”میں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے مارنا ہے تو مار دو۔“ زاریہ نے سکون سے کہہ دیا۔

”یہ جو تم نے مرنے کی رٹ لگا رکھی ہے نا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہیں کتنی بھیانک موت دوں گا۔ سکا سکا کر ماروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا پھر کافی حد تک محل سے بولا۔ ”مجھے بتاؤ، آخر تمہارا دماغ کیوں خراب ہوا۔ میں اب بھی تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ میں تمہیں رضا کی جگہ بٹھادوں گا۔ ورنہ وعدے کے مطابق چاہو تو ملک سے باہر جاسکتی ہو۔ جائداد ہمارے نام کر کے۔“

”اسے یہ بھی سمجھا دو کہ اس کے مرنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ جائداد کے کاغذات تو ہمارے پاس آ ہی جائیں گے۔ اس کے نام کی جائداد بھی مجھے مل جائے گی۔ اس کا مرنا ہمارے لیے گھائے کا سودا نہیں۔“ بلقیس نے اجنبی لہجے میں کہا۔

”تم لوگ جو مرضی چاہے کرو۔ مگر میں رضا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔“ وہ سکون سے بولی

”کیوں۔ یہ اچانک اس کے لیے تمہارے دل میں ہمدردی کیوں؟“ اس نے تڑپ کر غصے میں کہا۔

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ زاریہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ شخص آپے سے باہر ہو گیا۔

”زاریہ۔! بہت ہو چکا تمہارا مرنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔ دولت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے ایک زنانے دار پتھر اس کے منہ پر دے مارا۔ زاریہ پلٹ کر بیڈ سے نیچے جا گری۔ اس کے ہونٹوں سے خون نکلنے لگا۔ اس شخص نے یہیں بس نہیں کی۔ زاریہ کو بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بلقیس نے آگے بڑھ کر زاریہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ اس کی آواز بھی نہ نکل سکے۔ کچھ دیر بعد زاریہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ مگر وہ دونوں اس پر تشدد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ زاریہ کا سر بیڈ سے ٹکرایا۔ پھر اسے اتنا ہوش تھا کہ وہ قالین پر بے دم سی پڑی تھی۔ کپٹنی اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ وہ دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”اب اسے مر ہی جانا چاہئے۔ بعد میں بھی اسے زہر دے کر مارنا تھا۔ اب اسے وقت سے پہلے مارنا پڑ رہا ہے۔ جاؤ رسی لاؤ۔“ اس شخص نے غراتے ہوئے نفرت سے کہا۔ زاریہ نے ڈوبتی سانسوں سے دیکھا۔ بلقیس رسی لے آئی۔ وہ دونوں اسے باندھنے لگے۔ زاریہ مزاحمت نہ کر سکی۔ وہ باندھ چکے تو اس شخص نے کہا۔

”اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ اور تم یہاں سے سارا قیمتی سامان نکال لو۔ میں یہاں سب سنبھال لوں گا۔ تم مجھ سے رابطہ رکھنا۔ جب کہوں تب واپس آنا۔ میں کچھ دیر بعد گاڑی بھیجتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دونوں باہر چلے اور کمرے میں بیٹا نا چھا گیا۔ زاریہ موت کے قدموں کی چاپ سننے لگی۔ بے بسی کی موت، لا حاصل موت، وہ لہجہ بہ لہجہ موت کے سمندر میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی، ذرا سی قوت بھی اس میں نہیں تھی۔ زندگی کے ساحل پہنچنے کی شدید تمنا، سمندر میں تیرتی بادبانی کشتی کو آواز دینا چاہتی تھی مگر نہ دے سکی اور پھر آخری چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی۔

زاریہ کے سامنے کا منظر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اسپتال میں تھی اور اس کے ارد گرد اجنبی لوگ کھڑے تھے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہ رضا پر آن لگی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ اس نے رضا کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور بے ساختہ کہا۔

”رضا..... تم.....“

رضانے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ تب سینئر ڈاکٹر نے رضا کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو، اب یہ نارمل حالت کی طرف لوٹ آئی ہے لیکن احتیاط بہر حال لازمی ہے۔ چند دن میں ہم اسے ڈسچارج کر دیں گے۔“ وہ لوگ چلے گئے اور وہ دونوں وہاں تھے۔ زار یہ نے رضا کو خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ اسے یوں تھامے بیٹھی تھی جیسے اگر اب اس نے رضا کو چھوڑ دیا تو پھر دوبارہ نہیں پاسکے گی۔ کتنے ہی لمحے یوں ہی بیت گئے۔

”تم آرام کرو میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔“ رضانے خود کو الگ کرتے ہوئے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

”میں کہاں ہوں اور تم یہاں کیسے۔“ زار یہ نے تجسس سے پوچھا۔

”سب بتا دوں گا اس وقت تم اپنے دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔ سکون سے رہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے“ رضانے اس کا ماتھا تھپتھپایا تو اس نے واقعاً سکون سے آنکھیں موند لیں۔



اگلے چند دن میں زار یہ بہت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن رضا ایک عجیب طرح کی الجھن میں پھنس گیا تھا۔ زار یہ کے لیے اس کے جذبات و احساسات ایک بھائی کے تھے۔ اس کی تمام تر کوشش ایک بھائی کا فرض تھی جو ایک بہن کے لیے ہونی چاہیں۔ اس کوشش میں ایک خواہش بھی گھٹی ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ زار یہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اس نفرت کو اپنے لیے محبت میں بدلنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس سے ملی تو ہوش و حواس سے بے ریگا نہ تھی۔ اب وہ ہوش میں تھی۔ ایسے لمحات میں وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ماضی کی کوئی یاد اسے ڈسٹرب کرے یا ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوکھو کر کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ اس لیے وہ بہت کم اس کے سامنے جاتا تھا۔ رضا کے لیے سب سے اہم بات اس کی بڑ بڑا ہٹ تھی کہ وہ کیسا دھوکا تھا جو وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس وقت تک صبر کرنا تھا جب تک وہ خود اپنے من کی بات نہ کہہ دیتی۔ اسی باعث وہ پولیس تفتیش میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ نجانے اسے کیوں احساس تھا کہ بات یہیں سے نکلنے والی ہے۔ یہ ساری باتیں ایک طرف، اس کی اصل الجھن کا سبب کچھ اور تھا۔ زار یہ کا رویہ ایسا نہیں تھا جو ایک بہن کا اپنے بھائی کے لیے ہو سکتا تھا۔ کئی مواقع پر وہ ٹھک جاتا تھا کہ وہ اس رویے کو کیا سمجھے؟

پہلی بار اسے تب احساس ہوا تھا جب شام کے وقت وہ اسپتال کے کپاؤنڈ میں آ بیٹھے تھے۔ زار یہ نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ خاصی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی، جیسے خیالوں میں کہیں دور پہنچی ہوئی ہو۔ اسی خاموشی میں اس نے رضا کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھیں موند کر تادیر بیٹھی رہی جیسے کوئی سہارا مل جانے سے پرسکون ہو جائے۔ رضانے جب مضبوط ہوتی گرفت کو محسوس کیا تو دھیرے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ تب وہ چونکتے ہوئے حواسوں میں آ گئی۔ اس نے شاکی نگاہوں سے رضا کی طرف دیکھا اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”رضا! جانتے ہو خواہش اور حقیقت کے درمیان سفر کیسے طے ہوتا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی وہ خاموش رہا تو کہنے لگی۔ ”صرف اور صرف لگن سے، جتنی شدید لگن ہوگی۔ سفر اتنی جلدی طے ہوگا، خواہشیں ان کی پوری نہیں ہوتیں جو لگن نہیں رکھتے۔ میں مانتی ہوں زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، پھر اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آنا۔ لیکن بندہ کم از کم اس دنیا سے جائے تو اس میں کسی کو پالینے کی لگن ضرور ہونی چاہئے۔“

”تب پھر ان خواہشیوں کا کیا ہوگا۔ جو ادھوری رہ جاتی ہیں؟“ رضانے یوں ہی بات بڑھانے کو پوچھا۔

”نہ پوری ہوں۔ خواہشیں تو پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن ایسی خواہشیں بے فائدہ اور لا حاصل ہوتی ہیں جن میں لگن نہیں ہوتی۔ میں صرف لگن کی سچائی کو مانتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھو گئی۔ پھر اچانک بولی۔ ”خیر! میں کیا موضوع لے کر بیٹھ گئی ہوں۔“

تب رضانے یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ موسم کی، ادویات کی اور اسپتال کی باتیں، جن کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

اگلی شام زار یہ نے خواہش کی کہ وہ کھلی فضا میں کچھ دیر گھومنا چاہتی ہے۔ رضانے ڈاکٹر سے اجازت لی اور اسے لے کر نکل گیا۔ وہ پسینہ خیز بہت خاموش تھی۔ اس شام زار یہ نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہلکے پیاز کی رنگ کے شلوار سوٹ میں پیاری بھی لگ رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور گلے میں پڑا آچل بھی لہرا رہا تھا۔ وہ ایک پارک میں چلے گئے۔ دونوں خاموش تھے اور چہل قدمی کے انداز میں روش پر جا رہے تھے۔ بھی زار یہ کی نگاہ ایک جوڑے پر پڑی۔ وہ قد رے نیم تاریک گوشے میں بیٹھ کر بیٹھے مٹھو گنگو تھے۔ وہ نو بیابا جوڑا تھا۔ وہ ایک دوسرے میں یوں گم تھے کہ انہیں آس پاس کی خبر ہی نہیں تھی۔

”کتنے خوش قسمت ہیں یہ دونوں، ارد گرد کے منظر سے بے نیاز اپنی دنیا میں کیسے مست ہیں۔ ان دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہے ناجوانیں اس قدر قریب کیسے ہوئے ہے۔ ورنہ تنہائی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔“ زار یہ نے اداس لہجے میں کہا۔

”میرے خیال میں تنہائی بھی تو ایک رویہ ہے نازار یہ۔ دیکھا جائے تو انسان ہر وقت تنہا ہے اور چاہے تو انسان اپنے اندر میلہ لگا سکتا ہے۔“ رضا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ٹم ٹھیک کہتے ہو رضا۔ فطری ضرورت ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، بعض اوقات تو یہ مجبوری بن جاتی ہے۔ لیکن وہ کون سی شے ہے جو انسانوں کو جوڑے رکھتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنی ہے۔ میرے خیال میں وہ شے محبت سے بھی ماورا ہوتی ہے اور اس کا نام ابھی تک لفظ میں نہیں ڈھلا۔“ اس نے کہا اور ایک خالی بیچ پر بیٹھ گئی۔ رضا بھی پیٹھ گیا تو وہ اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ چند لمحے پونہمی گزر گئے۔ وہ چونک اٹھا۔ اسے لگا جیسے کئی کی آج سٹ کر اس تک آن پہنچی ہو۔ جیسے کوئی مومی مجسمہ ہو اور زار یہ کے بدن کی آج اسے پھلکا دینے کے درپے ہو۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ رضا کے اندر بہن کے پیار کی ٹھنڈک پوری طرح موجود تھی۔

رضا کی نگاہوں میں ایک ایک منظر تھا۔ ہر بار کے لمس میں ایک ہی پکارت تھی۔ جیسے وہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن رشتے کا تقدس ایسی سوچ کو حیا کے بھاری پتھر سے چل کر رکھ دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہی وہ چند رشتے ہوتے ہیں، جن کے باعث زندگی میں حرمت ہے۔ وہ اپنی اس ابھرنے والی کوسئی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر ایسا کر لیتا تو اس کی اپنی ذات انتہائی گھٹیا لگے گی۔ میں گر کر چکنا چور ہی نہ ہو جاتی بلکہ گل سڑ جاتی۔ نجانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ زار یہ جذبات کے ایسے آبشار کی مانند ہو گئی ہے جیسے اپنے پر بھی اختیار نہیں رہا۔ اس کے دماغ کی ایسی کون سی گرہ ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کیا وہ ماضی بھول چکی ہے، یا اپنے طور پر کسی نئی دنیا میں بس رہی ہے؟ اسے ڈرتا تھا کہ کوئی ذہنی جھٹکا اسے پھر سے اسی مقام پر نہ لے جائے جہاں سے وہ اسے بچ کر لایا تھا۔ وہ ایک پل صراط تھی جس پر چلتے ہوئے وہ انتہائی مضطرب تھا۔ پھر ایک دن اس نے زار یہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تقدس کو آلودہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا جب وہ دونوں جھیل کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر گہرے سرمئی بادل تھے۔ یوں جیسے ابھی برس پڑیں گے۔ جس طرف وہ کریسیوں پر نیم دراز تھے، اس جانب درخت نہیں، پختہ سڑک تھی جس کے ساتھ ساتھ گہری سبز گھاس والا قطعہ دور تک چلا گیا تھا۔ جھیل کے باقی اطراف میں دور دور تک درخت تھے جن پر سبز رنگ کے مختلف شیڈ والے تپتے ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور انہی درختوں سے گرے آوارہ پتے ہوا کے دوش پر تھے۔ زار یہ نے بھی گہرے سبز رنگ کی شلوار سوٹ پر آف وائٹ شال لی ہوئی تھی۔ کھلے بالوں کے ساتھ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور وہ مسلسل رضا کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں بھی جھیل کی مانند خاموش تھے۔ جبکہ رضا اتنا ہی مضطرب تھا۔ اب نجانے اس جھیل کی تہوں میں کیا تھا۔ مگر اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ وہ منتظر تھا کہ زار یہ کوئی بات کہے اور اسی کا سرا پکڑ کر اپنی بات کہہ دے۔ کافی دیر بعد وہ بولی۔

”کتنارومانوئی ماحول ہے لیکن لوگ کتنے کم ہیں یہاں پر یوں لگ رہا ہے کہ مادی زندگی نے ہماری روح کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ ہم اپنا سکون شور شرابے میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید ہم جسم اور روح کے تعلق کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔“

”اصل میں رشتوں کا تقدس ہی معاشرے کی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ یہ نہ ہو تو سب عشقہ کی نیل کی مانند ہو جائے۔ جو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے تقدس کے درخت کا رس چوس کر اسے سکھا دیتے ہیں۔“ رضا نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گئی۔ جیسے کسی نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اچانک اسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے حیرت سے رضا کی جانب دیکھا اور پھر بولی۔

”مجھے اسپتال سے کب ڈسچارج کیا جا رہا ہے؟“

”جب میں سمجھوں گا کہ تم بالکل صحت یاب ہو گئی ہو۔ کہیں ایسا نہ وہ تم۔“ رضا نے کہنا چاہا تو اس نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے اب تمہارے خلاف ہونے والی سازش کو بے نقاب کرنا ہے۔“

”کیسی سازش؟“ رضا نے بے تابانہ پوچھا تو زار یہ نے چند لمحے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی پجاری کسی مقدس مورتی کو دیکھتی ہے۔ پھر یوں بولی جیسے اس کی آواز بکھر بکھر کر سمٹ رہی ہو۔

”میں سلمان اشرف کی بیٹی نہیں ہوں اور نہ ہی بلیکس خاتون تمہارے پاپا کی بیوی ہے۔ یہ سب پلان تھا جو تمہاری جائداد ہتھیانے

لے لیے کیا گیا تھا۔“ وہ اتنا کہہ کر رضا کے چہرے پر رد عمل دیکھنے لگی۔ جہاں حیرتیں اتر آئی تھیں۔ ”میں ایک غریب گھر کی خواہشوں کی ماری لڑکی ہوں جو پڑھ لکھ کر اپنی دنیا آپ بنانا چاہتی ہے۔ بلیقیس میری رشتے دار ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئی تاکہ نہ صرف میرا خرچ بچ جائے بلکہ بڑے شہر میں موجود وسائل سے اپنا حصہ سمیٹ لوں۔ اس کی نوازشیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے مجھے اپنا پلان سنایا۔“

”کیا تھا پلان؟“ رضاً نے بے ساختہ پوچھا تو زار یہ اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہتی چلی گئی۔
 ”اس کے ڈاکٹر کے پاس اسی شہر کا ایک معزز اور امیر شہری زیر علاج تھا۔ بلیقیس خاتون کو وہاں نرس اس شخص نے رکھوایا تھا۔ کیونکہ کبھی ماضی میں ان دونوں کی شناسائی رہی تھی۔ اس شخص کو کینسر تھا۔ اور وہ تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شخص سلمان اشرف تھا۔“
 ”کیا! پاپا کو کینسر تھا؟“ رضاً چیخ اٹھا۔

”ہاں! انہوں نے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ صرف ڈاکٹر اور نرس بلیقیس خاتون جانتی تھی۔ تمہارے پاپا نے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس کے گھر والوں کو تو قطعاً نہیں۔ کیونکہ موت کا احساس، موت سے پہلے مار دیتا ہے۔ وہ تو اس اذیت سے گذر ہی رہا ہے، دوسروں کو کیوں مبتلا کرے۔“

”اُدھ۔! پاپا فقط ہماری خوشی کی خاطر اکیلے دکھ جھیلے رہے۔“ رضایوں بلک پڑا جیسے اس کے دل میں خنجر پیوست ہو گیا ہو۔
 ”پرانی شناسائی اور راز دار ہونے کا فائدہ بلیقیس نے اٹھایا۔ لیکن ایک اور شخص بھی اس پلان میں شامل تھا۔ ان لوگوں نے مجھے راتوں رات امیر ہو جانے کا کہا اور میں مان گئی۔ دولت میری کمزوری ہی نہیں ضرورت بھی تھی۔ میں کاغذات میں زار یہ ریاض سے زار یہ سلمان بن گئی۔ اور پھر ہم سب تمہارے بابا کی موت کا انتظار کرنے لگے۔ جو طویل ہوتا گیا اور اس میں ڈیڑھ برس لگ گیا۔ تب بلیقیس سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے تمہارے پاپا کو سلو پوائزن دینا شروع کر دیا۔ اس کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب تمہارے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے۔“
 ”تو میرے پاپا کی قاتل بلیقیس ہے؟“

”شاید ہاں۔! شاید نہیں، کیونکہ اس سے سب کچھ وہی شخص کرواتا تھا جو اس پلان میں شامل تھا۔ جیسے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہی سب کچھ بلیقیس سے کہتا اور وہ کرتی جاتی۔ اس دن قبرستان میں ہماری ملاقات اتفاقاً نہیں بلکہ وہ بھی پلان کا حصہ تھی۔ تب میں گئی اور تم پر نگاہ پڑنے سے پہلے تک میں پلان کا حصہ رہی لیکن جیسے ہی تمہیں دیکھا میری دنیا بدل گئی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں دھوکا نہیں دینا اور.....“

”اور کیا؟“ رضاً نے اپنے اندر کے دکھ کو پوری طرح دباتے ہوئے کہا۔
 ”اور تمہیں پانا ہے۔ تم میرا آئیڈیل ہو رضا۔“ زار یہ نے پانگوں کی طرح اس کے چہرے پر یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے پوری دنیا وہیں سمٹ کر آ گئی ہو۔

”تمہارا آئیڈیل، تمہارے لیے اتنا اہم تھا کہ تم نے دولت اور جائداد چھوڑ دی؟“ رضاً نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔
 ”ہاں! میرے لیے اتنا ہی اہم ہے۔ میں تمہیں اپنی کھلی آنکھوں کے خواب میں تب سے دیکھ رہی ہوں۔ جب سے میرے اندر کی فضلیں پکنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہرن کے نانے سے پھیلنے والی مہک کو سبھی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ مہک نانے میں پیدا کب ہوتی ہے؟ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ حالانکہ یہ اس کے اندر کا اظہار ہوتی ہے۔ میں تمہاری معصومیت، وجاہت اور مردانہ پن پر قربان ہو گئی، مجھے اس دن احساس ہوا کہ زنانہ مصر نے اپنی انگلیاں کیسے کاٹ لی ہوں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے میری جان چلی جائے، تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔“ زار یہ اپنے جذبات کی رو میں بہتی ہوئی کہیں چلی گئی۔
 ”اور تمہیں اس حال تک کس نے پہنچایا۔“

”بلیقیس اور اس شخص نے“ کیونکہ میری وجہ سے ان کا پلان ختم ہو گیا۔ تم نے تو پورے خلوص سے جائداد ہمارے نام لگا دی۔ میں نے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا انکار میری موت ہے اور میں نے موت قبول کر لی، وہ تو مجھے مار کر پھینک گئے تھے۔ یہ میری زندگی بھی یا میری محبت کی سچائی کہ میں پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آئی ہوں اور آج وہ میرے پاس ہے جس کی چاہ میں نے خود سے بڑھ کر کی ہے۔“
 زار یہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ سب کچھ کہہ کر یوں ہلکی پھلکی اور پرسکون ہو گئی تھی کہ جیسے خلاؤں میں تیر رہی ہو۔ پہ در پہ انکشافات نے رضا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کئی سوالوں نے بھی جنم لے لیا۔ یہ موقع نہیں تھا کہ وہ زار یہ سے کہتا۔ اس لیے وہ بولا۔

”زار یہ۔! آؤ چلیں، باقی باتیں کل کریں گے۔ شام ڈھل گئی ہے“ تب اسے احساس ہوا کہ جھیل، درختوں اور پورے منظر کو اندھیرا نکل رہا ہے۔ وہ واپس چل دیے۔



شبانہ بیگم کے لیے یہ انکشافات یا گل کر دینے والا تھا کہ سلمان اشرف نے انہیں دکھ نہ دینے کی خاطر اپنا روگ چھپائے رکھا۔ شاید اتنا درد اس نے سلمان اشرف کی موت پر محسوس نہیں کیا۔ جتنا وہ اب کر رہی تھی۔ وہ رضا سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدتِ غم سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ اسے خود پر قابو پانے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ پھر اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

”رضا۔! مجھے یہ احساس تو تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے اور وہ سچ ثابت ہوا لیکن اب بھی دیکھنا کوئی نیا جال تمہارا منتظر نہ ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فیض الدین جیسا با اعتماد ملازم یہ سب پلان کرے گا۔“

”شاید فیض الدین کے بارے میں پتہ نہ چلتا مگر بلیٹس خاتون کی گرفتاری کے بعد یہ سارے انکشافات ہوئے اور زار یہ کی کبھی ہوئی ہر بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے اعتراف جرم کر لیا اور فیض الدین کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔ اصل میں سارا پلان اس نے بنایا تھا۔“ رضا نے وضاحت کی۔

”فیض الدین نے پرانی رفاقت کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تمہارے پاپا کے سارے زوال و عروج سے واقف تھا۔ اس کے لیے یہ کہانی گھڑنا، پرانی چیزوں سے تصدیق کروانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ وہ جعلی نکاح نامہ بھی بنوا سکتا تھا۔ جیسے اس نے زار یہ کے بارے میں کہا لیکن ایسا کر کے وہ بلیٹس کو بیوی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف وہ وراثت کی حصہ دار ہوتی اور دوسری طرف قانونی وارث پھر اسے کیا ملتا؟“

”ہاں۔! اس نے یہ بھی اعتراف کیا۔“ رضا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”دراصل بیٹا۔! وہ ایک منافق شخص تھا اور منافق لوگ اس مادہ سانپ جیسے ہوتے ہیں جو اپنے ہی سپولیوں کو نگل جاتی ہے۔ حسد کا زہر انہیں خود بے چین رکھتا ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ لہو لہا اپنی ذات میں غلاظت بھر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے تو منافق دنیا کے غلیظ ترین انسان ہوتے ہیں۔“ شبانہ بیگم نے قدرے سختی سے کہا۔

”ماما۔! آپ فکر نہ کرو۔ میں اب محتاط ہوں۔“ رضا نے یہ کہہ کر اپنی پاپا کو اطمینان دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر خود مطمئن اب بھی نہ تھا۔ اس کے سامنے زار یہ کا رویہ تھا۔ وہ اپنے لفظوں میں سچی ثابت ہوتی تھی۔ ان چند دنوں میں اس نے زار یہ کے بارے میں بہت متضاد سوچا تھا۔ اسے نجانے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ اس نے فیض الدین سے بھی بڑا پلان کیا ہوا ہے۔ تھوڑی سی جا کدا اور دولت کے عوض وہ اپنا آپ نہیں گنونا چاہتی بلکہ اس نے تو رضا ہی کو پانے کا سوچ لیا تھا۔ یہ آئیڈیل اور محبت کا فلسفہ اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ لیکن۔! دوسری طرف اسی خیال کی تردید بھی ہو جاتی۔ وہ لڑکی جو بے ہوشی کی حالت میں بھی اسے دھوکا نہ دینے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ یہاں تک کہ اس نے موت بھی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ عمل ایسا نہیں تھا کہ اس پر سرے سے لکیر پھیری جاسکے۔ اسی تصدیق اور تردید سے ایک نئی کشمکش نے جنم لیا تھا۔ مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ ڈاکٹرز نے زار یہ کو ڈسچارج کرنے کے بارے میں کہہ دیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے حتمی بات کرنا تھی۔

وہ ایک خوشگوار صبح تھی سفید آسمان شفاف تھا۔ جس سے سورج کی روشنی نے ہر شے کو چمکا دیا تھا۔ زار یہ کو ڈسچارج کر دیا گیا ہوا تھا اور وہ جانے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ فیصل اور عاتکہ اس کے پاس موجود تھے، جب رضا ان کے پاس پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی کمرے کی فضا جیسے جاگ اٹھی تھی۔

”سوری اپوری باڈی۔! میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔ تو پھر چلیں؟“ رضا نے خوش کن لہجے میں کہا۔

”کہاں؟ کہاں جانا ہے مجھے؟“ زار یہ نے دکھ اور تجسس کے گھلے ملے لہجے میں پوچھا تو رضا چند لمحے خاموش رہا پھر فیصل اور عاتکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اچھا کیا تم نے یہ سوال کر دیا، تمہارے سوال کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ ہمارے گھر، لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہو گا کہ وہاں تمہاری حیثیت کیا ہوگی۔“

”ہاں، میں سمجھتی ہوں کہ یہ طے ہونا چاہئے۔ ایسا کیوں ہے یہ میں جانتی ہوں۔“ عاتکہ نے تیزی سے کہا۔

”تو پھر سنو۔! زار یہ میرے گھر میں میری بہن کی حیثیت سے رہے گی۔ جو اس کا تعارف۔“

”نہیں رضا۔! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم نے کہہ دیا اور میں نے مان لیا۔“ زار یہ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔

”کیا حرج ہے۔ میں نے تمہیں زبان سے بہن کہا تو دل سے بھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں ایک بہن کی عزت اور مان دوں گا۔ ہر وہ۔“ رضا نے آہستگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ میں نے نہیں کہا اور نہ میں نے مانا، میں نے جو مانا۔ وہ تم جانتے ہو۔ میں مروتو سکتی ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتی۔“ زار یہ نے یوں کہا جیسے زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی ہو۔ اس کا چہرہ ایک دم سے پیلا ہو گیا تھا۔ فیصل نے اس کی بدلتی ہوئی حالت کو محسوس کر لیا تھا۔

”زار یہ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں اس کے لیے ترس رہا ہوں۔ میں نے پہلی نظر سے لے کر اب تک تمہیں بہن ہی کے روپ میں دیکھا ہے۔ اسی رشتے سے تجھے سوچا ہے اور وہی مقام میں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا کہ تم نے فیض الدین سے بھی بڑا پلان کیا۔ جس کا سب کچھ ہے۔ اسی کو اپنا لو تو سب کچھ تمہارا ہوگا۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کیونکہ میں اب بھی تمہیں سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یہاں کا سب کچھ تیرے حوالے، بس تم ایک بہن کا مان مجھے دے دو۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے رضا کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”نہیں رضا۔! میں تمہاری زندگی سے بہت دور جا سکتی ہوں۔ لیکن میں اپنے آئیڈیل کو اپنے ہاتھوں پاش پاش نہیں کر سکتی۔“

”دیکھو میں نے تمہیں بہن سوچا، سمجھا اور تسلیم کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتی جو تم سوچ رہی ہو وہ میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔“ رضا نے اسے کہا۔

”اور یہی جذبات میرے ہیں رضا۔“ وہ سکون سے بولی۔

”تو پھر فیصلہ کیا ہوگا۔ تم دونوں دریا کے ان کناروں کی طرح ہو جو مل نہیں سکتے۔“ تب اچانک فیصل نے کہا

”میں تم سے کچھ تمہیں نہیں مانگتی رضا۔ اور نہ تمہاری دنیا میں آؤں گی۔ مجھے تمہاری دولت اور جائیداد سے بھی کچھ نہیں چاہیے۔ اب اگر دینا بھی چاہو گے تو میں نہیں لوں گی۔ تم اپنی دنیا میں خوش رہو۔ بس ایک شے مانگتی ہوں اگر دے سکو تو؟“ زار یہ نے عجیب سے لہجے میں یوں کہا جیسے کوئی اپنی آخری خواہش بیان کر رہا ہو۔

”بولو۔“ رضا نے حیرت سے کہا۔

”تمہیں تمہارے لفظوں کا پاس مبارک ہو۔ لیکن مجھے وہ احساس دے دو جو محبت سے بھی ماورا ہوتا ہے۔ اور شاید اس کے لیے کوئی لفظ نہیں بنا۔ میں اسے حاصل ہی نہیں کرنا چاہتی جو میرا نہیں تھا مگر اسے تو بچا سکتی ہوں جو میرا اپنا ہے۔ کیا تم مجھے وہ احساس دے سکتے ہو۔“ زار یہ نے یوں کہا جیسے کسی وادی میں کھڑے ہو کر زور سے آواز دے دی جائے۔ رضا کو بڑی دیر تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تب زار یہ نے فیصل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آؤ فیصل۔! چلیں ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی کمرے کی طرف نہیں دیکھا۔ فیصل نے بیگ اٹھائے اور اس کے پیچھے چل دیا۔ رضا نے شدت دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔ بھی عاتکہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ تمہیں اپنے لفظوں کی حرمت پر فخر کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں ناکہ انسان کو بھی اختیار ہے کہ وہ اپنا مقدر بنا سکتا ہے۔ اس نے اپنی قسمت خود چن لی ہے۔ وہ فیصلے جو آسمانوں پر ہو جاتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آؤ چلیں۔“

رضا نے عاتکہ کی طرف دیکھا اور اٹھ گیا۔ پھر دونوں چلتے ہوئے پارکنگ تک آ گئے۔ جہاں سیوہ فیصل اور زار یہ کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ رضا ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ انسان حرمت سے کیا کچھ پالیتا ہے۔

